

ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی کا سفر نامہ ”تھائی لینڈ کے رنگ“ کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر صدیق اقبال

اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ ملاکنڈ

ریحانہ زمان

لیکچرار جامعہ ملاکنڈ

شفیع ناز

لیکچرار جامعہ ملاکنڈ

Abstract: It is human nature that he often feels bored with the uniformity of the environment. To remove this effect, he wants some kind of change. This desire for change makes him willing to travel and he tries to overcome his boredom and by visiting new places. The desire to get more information about the history and geography of new countries and the manners and customs, customs and culture of the nations also made people to travel. A link in the same chain is the travelogue. In the history of Urdu travelogue, from the nineteenth century until now, various travel writers have been associated with the travelogue genre one after the other. One of the travel writers who have kept this tradition alive till date is Dr. Altaf Yousafzai. So far many of Dr. Sahib's works have come on the ground, but the literary genre that gave his name prestige is there is an itinerary. Three of his travelogues have been published so far. These travelogues of his are a great treasure for Urdu literature, from which the reader of literature is benefiting in a rich way. These travelogues are a testament to Dr. Altaf's services. In the article under review, an analytical study of Dr. Altaf Yousafzai's travelogue of تھائی لینڈ کے رنگ will be presented.

Key words: Dr.Altaf Yousafzai, Travelogues, Civilization and Culture, Gender Mixture, Historical Consciousness, Massage Center, Patriotism, Flashback, Thai Woman, Thai Patan, Scenery, Comedy, Narrative

سفر نامے کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا سفر نامے سے ملکوں اور قوموں کے حالات سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ سفر نامے صرف معلومات میں اضافے کا باعث نہیں ہوتے بلکہ اس سے مختلف ملکوں کی مختلف تہذیبوں، زبانوں، رہن سہن، رسم و رواج اور طرز معاشرت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اردو سفر نامے کی تاریخ میں انیسویں صدی سے لے کر تاحال یکے بعد دیگرے مختلف سفر نامہ نگار سفر نامے کی صنف سے وابستہ رہے۔ اسی روایت کو آج تک جن سفر نامہ نگاروں نے زندہ رکھا ان میں ایک نام ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا بھی ہے۔ ان کے سفر ناموں میں مطالعے کی وسعت، فکر کی گہرائی، تخیل کی بلندی اور سماجی رکھ رکھاؤ کی مثالیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اب تک کئی تصانیف منصفہ شہود پر آچکی ہیں، لیکن ان کے نام کو جس ادبی صنف نے وقار بخشا وہ سفر نامہ ہے۔ اب تک ان کے تین سفر نامے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان سفر ناموں میں ایک نام ”تھائی لینڈ کے رنگ“ بھی ہے۔ یہ سفر نامہ علمیت و ادبیت سے پُر ہے جو تھائی لینڈ کی معاشرت، تہذیب، ثقافت، معیشت، تعلیم اور دیگر سماجی امور کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نذر عابد:

”ڈاکٹر الطاف یوسف زئی اپنے اس سفر نامے میں ایک البیلے سیاح کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ جو تھائی لینڈ کے مناظر کو کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کا کھلی بانہوں سے استقبال کرتا ہے۔ اور ان کے خیالات اور احساسات و جذبات کو کھلے ذہن سے پڑھتا ہے۔ ان کی اسی کشادہ نظری اور وسعت قلبی نے انھیں تھائی لینڈ کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے اور وہاں کے باسیوں کے باطن میں جھانکنے کا ظرف اور حوصلہ عطا کیا ہے۔“^(۱)

یہ سفر نامہ پہلی مرتبہ ۲۰۱۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا جو ادبی دنیا میں ان کے منفرد اور دل چسپ اسلوب کی وجہ سے بطور سفر نامہ نگار ان کی پہچان بنا۔ یہ سفر نامہ سفر تھائی لینڈ کی روداد پر مشتمل ہے۔ اپنے سفر نامے میں ڈاکٹر الطاف یوسف زئی ”ساتھ ساتھ چل کے بھی، راستہ مسافر ہے“ کے عنوان سے اس سفر نامے کے متعلق اپنی بات کچھ اس طرح رقم کرتے ہیں:

”تھائی لینڈ جانے کا میرا بنیادی مقصد اپنی علمی استعداد کی بڑھوتری تھا۔ دیکھا جائے تو میرا یہ سفر نامہ دو لفظوں کے گرد مطوف ہے اقدار کی زبوں حالی کا نوحہ اور نئی منزلوں کی تلاش پر خوشی کے گیت۔“^(۲)

اس سفر نامہ میں افسانہ، جگ بیتی، رپورتاژ، حقیقت، تصوف، مذہب، سائنس اور فلسفہ سب کچھ سما گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار خود مصنف ہے۔ اس کے علاوہ حقیقی کرداروں کی شمولیت نے اس سفر نامے کو زندگی کی قدروں کا آشنا اور حقیقت نما بنا دیا ہے۔ سفر نامہ تھائی لینڈ کے رنگ کے جائزے سے اس کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں جن کا تذکرہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے اس سفر نامے میں تھائی لینڈ کی تہذیب و ثقافت کو خصوصی طور پر موضوع بنایا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی صورت حال نے مشرق بعید کے ممالک کو بہت حد تک مغربی تہذیب کو اپنانے پر مجبور کیا۔ جس سے بہت سی قباحتیں جو صرف اہل مغرب کی پہچان تھیں مشرق بعید کے ممالک میں پھیلنے لگیں۔ جس کی وجہ سے تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہوا اور نئی اقدار متعارف ہوئیں۔ اس مخصوص تناظر میں ڈاکٹر الطاف تھائی لینڈ کی تہذیب و ثقافت کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

تھائی لینڈ کی ایک مشہور سیر گاہ جو دریا کے ساحل پر واقع ہے میرے لیے دلچسپی کے نئے سامان پیدا کرنے کا سبب بنی۔ وہاں میری ملاقات ایک نیم برہنہ آسٹریلوی باشندے سے ہوئی جو ایک تھائی لڑکی سے محض چوما چاٹی میں مصروف تھا۔ دونوں عمروں کے فرق کی وجہ سے باپ بیٹی لگتے تھے۔“ (۳)

تھائی لینڈ اور بنگاک میں کشش کا سب سے مستند حوالہ جنسی اختلاط ہے جو بہت کم قیمت میں باسانی میسر ہے۔ اس کی وجہ مغربی بے راہ روی ہے جس نے مشرقی تہذیب و ثقافت کی قدروں پر ضرب لگا کر مشرقی تہذیب کا حسن مسخ کر دیا۔ اس تہذیبی بگاڑ اور ان تجہ خانوں اور فاحشاؤں کے حوالے سے جب ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے اپنی استاد نیرومن سے بدھ مت کے مذہبی شخصیات کی رائے معلوم کی تو وہ بولیں:

” ہماری تہذیب میں قہجائی سرگرمیوں پر انگلی نہیں اٹھائی جاتی بلکہ یہ ملکی ترقی میں اہم خدمات کے مترادف ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کا مذہب عورت کے بارے میں کیا کہتا ہے وہ بولیں مجھے نہیں معلوم مگر ہمارے مذہب پیشوا ہم سے بات کرنا گناہ سمجھتے ہیں اور ہاتھ لگانا حرام۔ ہمارے لیے اُن کے سامنے جانا اور اُن سے اچھے موڈ میں گفتگو کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔“ (۵)

یہ اس ملک کی تہذیب و ثقافت ہے جہاں مذہب میں ترک دُنیا اور ترک تعیشت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، لیکن مغربی اقدار کی وجہ سے یہاں جنسی لذت کا کاروبار عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ ایک اور جگہ جنسی حظ اندوزی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر الطاف لکھتے ہیں:

”یہاں کی رنگین راتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں عریانی کا اشتہار بنی دوشیزائیں سیاحوں کو غمزوں، عشووں اور اداؤں سے بوم بوم کی دعوت دیتی نظر آتی ہیں۔ دنیا بھر سے جسم فروش حسینائیں یہاں دولت لوٹنے اور عزت لٹانے آتی ہیں“،^(۶)

بنکاک میں جنسی حظ اندوزی کا ایک حوالہ وہاں کے مساج سینٹرز ہیں جہاں جسمانی تسکین سے زیادہ شہوت خیز مساج کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مساج گاہوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر الطاف یوسف زئی لکھتے ہیں:

”شہر میں بے تحاشا مساج سینٹرز ہیں یہاں تک کہ ایئر پورٹ کے اندر بھی یہ سینٹر قائم ہیں جہاں تھائی دوشیزائیں گاہکوں کو بلا بلا کر مساج کرتی ہیں۔ دوسرے ممالک سے آئے سیاح شاید ہی تھائی لینڈ کی کسی اور چیز سے اس قدر لطف اندوز ہوتے ہوں جتنا مساج سے۔“^(۷)

مصنف نے سفر نامہ ”تھائی لینڈ کے رنگ“ میں تھائی عورت کے اس روپ کو پیش کیا ہے جو جنسی اختلاط کو کمائی کا ذریعہ بناتی ہے جہاں کے مذہبی پیشوا ان سے بات کرنا گناہ اور ہاتھ لگانا حرام سمجھتے ہیں۔ اس ملک کے حکمران اور سماج، عورت کو جس بے دردی سے استعمال کر رہے ہیں شاید ہی کسی دوسرے ملک میں ایسا ہو۔ یہاں ہر کام خواتین کرتی ہیں۔ نوکری، کاروبار، بچوں کی نگہداشت، گھر گرہستی ہر شعبہ عورت کے ذمے ہے۔ یہاں تک کہ حجامت اور زلف تراشی بھی عورت سے کرائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی سفر نامہ تحریر کرتے ہوئے شعوری طور پر مختلف تاریخی ادوار کی سیاحت بھی کرواتے ہیں، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ مورخ کی طرح تاریخ کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ معاشرے کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی جھلکیوں کو پیش کرنے میں نہ صرف دل چسپی رکھتے ہیں بلکہ وہ اس حوالے سے مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے ذوق مطالعہ کی بدولت تہذیب و ثقافت کے معنوں کو صحیح طرح سے استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے سفر نامے تاریخ کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے سفر نامہ ”تھائی لینڈ کے رنگ“ میں اس کے کئی حوالے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر وہ بنکاک کے شاہی محل کی تاریخ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تاریخ کے مطابق تھائی، چائے کے جنوب مغرب میں رہنے والی قوم ہے۔ اقوام عالم میں سنسکرت زبان کا طویل عرصہ تک ”سیام“ کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ سیام لفظ ہے جس کا مطلب ہے۔ ”شوخ“ یا ”بھورا“، مشرق بعید میں رہنے والی دوسری اقوام کے مقابلے میں ان کی رنگت شوخ اور بھوری ہوتی ہے۔ چینی سیام کو ”سیان“ بولتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اقوام عالم میں سب سے پہلے پرنگالیوں نے اس لفظ کا استعمال کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح پرنگالوں نے بھی سترھویں صدی کے اوائل میں سفارتی مشن بھیجا مگر جیسی سونے کی چڑیا ہندوستان انگریزی کے لیے ثابت ہوا، سیام سے پرنگالیوں کو کچھ نہ ملا۔ زمانہ قدیم سے یہ علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم رہا۔ جنگ سین ایوٹایا، چنگ مائی، لانا اور سوکھ تائی، یہ ریاستیں قدیم زمانے سے ایک دوسرے سے دست و گریباں رہیں اور قریبی ریاستوں ویٹ نام اور برما کے لیے درد سر بنی رہتی۔ ۱۷۶۷ء میں برمیوں نے ایوٹایا کی چار سو سال سے قائم ریاست پر حملہ کر دیا۔ دارالحکومت کو گویا آگ لگا دی، ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنی عمل داری قائم کی۔ ۱۷۶۹ء میں جنرل تاکسن نے بچی کھچی ریاست کو دوبارہ منظم کیا، تون بری کو نیا دار الخلافہ بنایا اور خود جنرل تاکسن کو سے کنگ تاکسن دی گریٹ بنا تیرہ سالہ حکمرانی میں جنرل کو اندرونی خلفشار، بیرونی سازشوں اور مسلسل جنگی حالات نے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا، پاگل پن کے دورے پڑنے شروع ہوئے اور آخر کار راہیب کالبادہ اوڑھ کر جنگل کی طرف بھاگ گیا اور اس کے بعد کہیں نظر نہ آیا۔“^(۹)

سفر نامہ ”تھائی لینڈ کے رنگ“ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا مطالعہ عمیق اور مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے اپنے گہرے مشاہدے، ذوق مطالعہ اور کمال مہارت سے تھائی معاشرے کے تمام پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ایک رہبر کی حیثیت سے قاری کی انگلی پکڑ کر اسے ساتھ لے کر چلتا ہے اور قاری کے لیے ذاتی مشاہدے کو تاریخی واقعہ کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری ملک کی سیر کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا مطالعہ بھی کر لیتا ہے۔

مطالعہ کائنات ایک ایسا ذوق ہے جو ادیب خاص کر سفر نامہ نگار کی کامیابی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے انہوں نے بھی اس ذوق سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس بھی خطے یا علاقے میں قدم رکھتے ہیں اس کی بود و باش سے دلچسپی

لینے لگتے ہیں تو قاری پر اس کے مختلف دروا کرتے ہیں۔ وہ اپنے سفر نامے میں مشاہدات کو الفاظ کی صورت میں مجسم کر کے پیش کرتے ہیں۔ سفر نامے کی ابتدا میں وہ خود تھائی لینڈ سے ناواقفیت کا اقرار کرتے ہیں مثلاً:

”اس ملک کے حوالے سے مسافر کی معلومات تین لفظوں سے زیادہ نہ تھیں۔ بنگاک، بدھ مت اور بارش۔“ (۱۰)

ان کی مشاہداتی نظر اور ذوق مطالعہ انھیں تھائی تہذیب اور ثقافت سے آشنا کرنے میں کارگر ثابت ہوئی۔ اس طرح وہ قاری پر بھی مختلف راز افشاں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”تھائی لینڈ کے لوگوں کا مزاج تنگ ہے۔ وہ بہت جلد اشتعال میں آتے ہیں۔ معمولی باتوں پر ان کا دل دُکھی ہو جاتا ہے اور جو اباناک بھوں ہی نہیں، آستینیں بھی چڑھا لیتے ہیں۔ وہ باقی اقوام کے مقابلے میں خود کو افضل سمجھتے ہیں۔ خود ستائشی کے دلدادہ تھائی لوگ غیر تھائی لوگوں کو ”کھیک“ پکارتے ہیں جس سے مراد کمتر لوگ ہیں۔ خواتین جس قدر محنتی اور وفادار ہیں مرد ایسے نہیں۔ اسٹیٹس اور برانڈ کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں چوں کہ مہذب دنیا سے میل جول تہذیبی نہیں اس لیے اپنی شخصیت کے بارے میں کوئی منفی بات گوارا نہیں کرتے۔ دوسروں پر رعب ڈالنے کے لیے بڑی گاڑی میں اکیلے سفر کرتے ہیں اور قیمتی موبائل، گھڑی اور گاڑی کی نمائش کرتے ہیں۔ فیشن کے معاملے میں جنوبی کوریا کو امام مانتے ہیں۔ سیول کے طرز زندگی کو شوق سے اپناتے ہیں لباس سے لے کر بال تراشنے تک اُن کا انداز اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ (۱۱)

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے اپنے سفر ناموں میں حب الوطنی کے رس بھی گھولے ہیں۔ وطن سے ان کی محبت اس بات سے عیاں ہے کہ جب وہ تھائی لینڈ میں خاتون گائیڈ سے اپنی زبان کے الفاظ سننے ہیں تو سارے سفر کی تھکن اتر جاتی ہے:

”خاتون گائیڈ گویا ہوئی چلو چلو۔۔۔ اس خاتون کی اردو چلو چلو سے آگے نہ بڑھی مگر ایک غیر ملکی کے منہ سے اپنی قومی زبان کے ایک ہی لفظ کو دو بار سن کر سفر کی ساری تھکن دور ہو گئی۔“ (۱۳)

اس سفر نامے کا سب سے اہم جذبہ ہم وطنوں سے محبت کا جذبہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے تھائی لینڈ میں مقیم پاکستانیوں خاص کر پٹھانوں کو تلاش اور ان کی زندگی کا پورا جامع اور مختصر نقشہ کھینچ دیا ہے۔ جب وہ وہاں ایک مسلمان سے ملتے ہیں جن کے والد کا تعلق پاکستان سے ہیں تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں ہوتی:

”میں نے پوچھا آپ مسلمان ہیں۔ تو اثبات میں سر ہلایا، پھر انھوں نے مجھ سے استفسار کیا کہ تم پاکستانی ہو میں نے کہا جی جی ان کو میری جی جی سمجھ نہ آئی اور سوالیہ انداز میں پھر سے اشارہ کیا تو میں نے کہا Yes I belong to Pakistan وہ ایک قدم آگے بڑھے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا My father also belong to Pakistan, I am Silman میرے منہ سے بے اختیار نکلازبردست۔ میں نے دوبارہ انتہائی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ پوچھا پاکستان میں آپ کے والد کا تعلق کہاں سے ہے انھوں نے کہا بنگرام سے۔ میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ بنگرام سے تھوڑے فاصلے پر ہزارہ یونیورسٹی ہے جہاں سے مسافر کارزق وابستہ ہے۔“ (۱۳)

پٹھانوں کے حوالے سے ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

” تھائی لینڈ کے دو اور پاکستانی شہریوں کا ذکر ضروری ہے۔ دونوں اپنے فن کی بلندیوں پر ہیں۔ ایک علمی دنیا کے امام ہیں تو دوسرے فلمی دنیا کے ولن۔ دونوں تھائی زبان کے ساتھ ساتھ رواں پشتو بھی بول لیتے ہیں۔ ساٹھ کے پیٹے میں زندگی گزارنے والے دونوں کردار ریڈار وچر اور باچا خان ہیں۔ باچا خان بنگاک میں دو تبلیغی مراکز کے انچارج ہیں جب کہ ریڈار وچر تھائی فلموں میں ولن کے طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ پاک وہند اور دوسرے ممالک سے تبلیغی مشنری جب مشرق بعید کے اسفار پر نکلتے ہیں تو بنگاک میں باچا خان اُن کا پرتپاک استقبال کرتے ہیں اور پھر ملک کے طول و عرض میں ان کی تشکیل کراتے ہیں۔ سادہ لباس، نیچے آواز، لمبی داڑھی اور چھریرے بدن کے مالک باچا خان نے بنگاک کے پُر تعیش ماحول میں ایک الگ رنگ کی دنیا بنائی ہے۔ اسی طرح بنگرام کے ریڈار وچر نے فلمی دنیا کو روزی کمانے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔“ (۲۳)

سفر نامہ ”تھائی لینڈ کے رنگ“ پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے وہاں خیبر پختونخوا دریا فت کیا ہے۔ اس کی مزید جھلکیاں اس اقتباس میں دیکھی جاسکتی ہیں:

”یہاں صدیوں سے پٹھانوں کا آنا جانا ہے، پٹھانوں کی ایک بڑی تعداد یہاں کی شہری ہے۔ یہاں تک کہ جنوبی تھائی لینڈ میں تو ایک صوبے کا نام بھی پٹھانی ہے۔ اسی طرح شمال میں چائنا کی طرف فٹ سانولوک اور چنگ مائی صوبوں میں کثیر تعداد میں پشتون آباد ہیں۔ فٹ سانولوک کے امپریل میاؤ پنگ ہوٹل کے سامنے ایک بہت بڑی پاکستانی مسجد ہے۔“ (۱۷)

مصنف لکھتے ہیں کہ

تھائی لینڈ کے جنوب میں پانچ صوبے، نراتی وت، ہد جائے، ستون، یلہ اور پٹھانی خالص مسلم آبادی والے صوبے ہیں۔ پاکستان خصوصاً خیبر پختونخوا کی بہت بڑی آبادی یہاں مستقل آباد ہے۔ وہی بود و باش، اسی طرح کے گھر، وہی حجرے، حجروں کے اندر دالان میں چار پائیاں لگتا ہے خیبر پختونخوا میں آگئے ہیں۔

اس سفر نامے کا سب سے جاندار اور شاندار کردار نیرو من کا ہے۔ وہ ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں پروگرام اسپیشلسٹ اور علمی و تربیتی و ترویجی شعبے کی صدر نشین ہیں۔ وہ اس ادارے میں آٹھ سال سے خدمات انجام دے رہی تھیں۔ وہ مصنف کو اپنے قول فعل سے متاثر کرتی ہے۔ ان کا شخصی وقار اور عاجزی و انکساری کا جذبہ ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا نظر آتا ہے، جن کے خدو خال کو بڑے مشاہدے کے بعد جان کر ڈاکٹر الطاف یوسف زئی ان کی شخصیت کا خاکہ کچھ اس طرح سے کھینچتے ہیں:

”بلند قامت، زردی مائل چہرہ، چہرے پر مسکراہٹ کا بسیرا دل میں جھانکنے والی مسکراتی آنکھیں، آواز کی بچ عام عورتوں سے قدرے مختلف اسی لیے جب بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اندر کی طرف دھسنے ہوئے کندھوں نے ان کی متانت اور عاجزی کو اور ابھارا تھا۔ نتھنے قدرے بھاری مگر چہرے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔“ (۲۱)

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کو جہاں تھائی لینڈ کی بے راہروی اور عورت کو کھلونا سمجھنے والے اس معاشرے نے مایوس کیا وہاں نیرو من کی محنت، سادگی، شخصی وقار اور عاجزی و انکساری کے جذبے نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ نیرو من کے علاوہ انھوں نے ایک گائیڈ خاتون کے خدو خال بھی بہتر پیرایے میں بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”پست قد، چھٹی ناک دھنسی ہوئی آنکھوں والی اس خاتون کی اردو چلو چلو سے آگے نہ بڑھی
مگر ایک غیر ملکی کے منہ سے اپنی قومی زبان کے ایک ہی لفظ کو دو بار سن کر سفر کی ساری
تھکن دور ہو گئی۔“ (۲۲)

کسی منظر کی تصویر الفاظ میں کھینچنا بہت مہارت کا کام ہے۔ یہ فی الواقع خارج سے داخل میں جھانک کر واقعات کی تصویر
کھینچنے کا ایک انوکھا تجربہ اور ایک مثالی صلاحیت ہے۔ مصنف نے اس صلاحیت سے اپنے سفر ناموں میں بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ کسی
منظر، اس مظہر کے اندرون میں جھانک کر اپنی داخلی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں گویا کسی مقام کی تصویر کشی میں ان کا وجد ان
ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ سفر نامہ ”تھائی لینڈ کے رنگ“ میں منظر نگاری نے ان کی تحریر پر عبور اور گرفت کو ثابت کیا ہے۔ ایک باغ کا
نقشہ وہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

”اتنے وسیع رقبے پر اتنا دلکش اور جاذب نظر باغ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا۔ یہاں
پودوں کو اس ہنر مندی سے کاٹا گیا ہے کہ اس سے بہت سے جانے انجانے جانوروں کی
شبہیں نمایاں ہوتی ہیں۔ شیر، زبیرا، گھوڑا، ہرن، ہاتھی، زرافہ، آبی جانوروں اور پرندوں
کی انواع و اقسام شکلیں پودوں کو خاص تراش خراش اور پتچ و خم دے کر پارک میں اس انداز
سے ظاہر کی گئی ہیں کہ دور سے بعض جانور بالکل اصلی حالت میں نظر آتے ہیں۔ ہاتھی کو کمال
مہارت سے چھوٹی اور بڑی شکلوں میں ان درختوں کی تراش خراش کی مدد سے نمایاں کیا گیا
ہے۔“ (۲۵)

اسی طرح ایک اور منظر کا نقشہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”بنکاک سے سوا گھنٹے کے فاصلے پر ایک مشہور ساحلی پٹی کا نام پاتیہ ہے۔ یہاں کا موسم
معتدل اور ماحول جذباتی اور گرم ہوتا ہے۔ سمندر خشکی کا حصہ ہڑپ کر کے دُور تک اندر در
آیا ہے مرکزی شاہراہ اور سمندر کے درمیان خاکستری ریت حائل ہے۔ جس پر سفید، پیلی،
بھورے اور سیاہ، سیاح برہنہ و نیم برہنہ لیٹے ہوتے ہیں۔ سمندر بھی یہاں کئی رنگ دکھاتا
ہے۔ بعض جگہوں پر پانی نیلا تو بعض جگہوں پر سبزی مائل خاکستری یا سیاہ ہوتا ہے۔“ (۲۶)

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کی سب سے زیادہ متاثر کرنے والی خصوصیت حس مزاج ہے۔ بات سے بات نکالنا اور بات میں مزاج کے پہلو تلاش کرنا اور ایک خاص سنجیدہ گفتگو کے دوران مزاحیہ فقرہ جڑ دینا ان کا خاصہ ہے۔ اسی حوالے سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

”نیرو من کا لباس انتہائی سادہ ہوتا تھا تیس دنوں کی اس ٹریننگ میں انہوں نے صرف تین شرٹس تبدیل کیں جب کہ ہمارے ساتھ آئی ہوئی بعض خواتین ایک دن میں تین دفعہ لباس تبدیل کرتی تھیں۔“ (۲۷)

اس حوالے سے ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

”میں نے پوچھا کیا بچے جنا ترقی نہیں،“ میرے نصیب میں تو یہ بھی نہیں محترمہ نے پھیکا سے منہ بنا کر روکھا جواب دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوفہ کو شادی کیے کئی برس بیت گئے ہیں مگر آنگن میں کوئی ہریالی نہیں اس لیے جب دو اداروں سے کام نہ چلا تو پیری و پرہیزگاری میں پھنس گئی۔“ (۲۸)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

”تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہی ڈراما کھیلا جا رہا ہے۔ نیٹ، مکالمے اور ماسک کی وقتی اور مقامی تبدیلیوں کے ساتھ اور شاید اسی لیے یوسفی جب اعوذ باللہ الشیطن الرجیم کہتے ہیں تو جیسے رجیم سے یہی Regime مراد لیتا ہو۔“ (۲۹)

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کے اسلوب میں مشتاق یوسفی کی مزاج نگاری اور مختار مسعود کی سنجیدگی موجود ہے۔ شیرینی اور کڑواہٹ دونوں کا سنگم اس اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے:

”انیر پورٹ پر ہی ہمارے منہ میں پولیو کے قطرے ڈالے گئے اور یہ احساس دلایا گیا کہ دنیا کے معاملات پر اس قدر غور و غوض کی ضرورت نہیں ابھی آپ لوگ مہذب دنیا کے لیے اپنا بچے ہی ہو۔“ (۳۰)

مصنف کا خاصہ یہ ہے کہ ان کا انداز جانب دارانہ اور معتصبانہ نہیں ہے۔ انھوں نے تھائی لینڈ کی سیاست اور بادشاہت کے انداز کی غیر جانب داری اور حقیقی رویوں کے ساتھ عکاسی کی ہے۔ انھوں نے وہاں موجود مساج سنٹرز کا جس حقیقی انداز میں نقشہ کھینچا

ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ وہاں کے حالات کا تقابل پاکستان سے کر کے پاکستان کا سیاسی منظر نامہ پورے حقائق اور غیر جانب داری کے ساتھ قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ تھائی ایئر ہو سٹس کا ذکر ہو یا باٹ اور سونا گلٹی ہوئی جاگتی راتیں یا ”بوم بوم“، کرتی بے لباس حسین دوشیزائیں یا مساج سنٹرز جہاں ہر نوع کے مساج ہوتے ہیں یا جنس کو نظریہ ضرورت کے طور پر اختیار کرنا۔ ان سب کے بیان میں ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے نہ ہی مبالغے سے کام لیا اور نہ ہی حقیقت کے بیان کرنے میں کسی پردہ پوشی کا سہارا لیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”یہاں کی راتیں سوتی نہیں بلکہ باٹ اور سونا گلٹی ہیں شہر میں کوئی ایسا کونا نہیں جہاں مخصوص بے لباسی میں حسینائیں کھڑی نظر نہ آئیں۔ مرکزی شاہراہیں ہوں یا بغلی گلیاں یہ حسینائیں مردوں سے بغل گیر ہونے کے اشارے کرتی نظر آئے گی۔ ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر یہ پری زادیاں ہر آنے جانے والے کو خاص جنسی رغبت کے پوز بناتے ہوئے دعوتِ باہ و بادہ دیتی ہیں۔ اس کھیل میں باہ گاہوں کی اور بادہ ان پری زادیوں کے مرمریں جسموں کی استعمال ہوتی ہے۔ اس جنسی عمل کو یہ خواتین بوم بوم کہتی ہیں۔“ (۳۱)

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی اپنے طرز بیان سے قاری کا دل مٹھی میں کرتے ہیں تو کبھی وہ موقع و محل کے مطابق اشعار کا سہارا لے کر اپنی تحریر کو دل چسپ اور جاذب نظر بناتے ہیں۔ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کے اسلوب کا یہ پہلو ان کے جمالیاتی ذوق کا مظہر ہے۔ انھوں نے اپنے سفر نامے میں جہاں اشعار کا استعمال کیا ہے وہیں ان کی نثر بھی شاعرانہ طرز لیے ہوئے ہیں۔ جس کی کئی مثالیں ان کے سفر ناموں میں دیکھی جاسکتی ہیں:

”ہر ایک سرو قد، آہو چشم اور مرمر بدن تھیں ہر ایک زلف سیاہ کوڑخ پہ پریشاں کیے ہوئے، سُرے سے تیز دشنہ مڑگاں کیے ہوئے، قہقہوں اور مسکراہٹوں سے چہرے گلستاں کیے ہوئے، ہمیں اپنی ان قہجہ خانوں کی طرف کھینچ رہی تھیں جہاں انھوں نے جوش قدح سے بزم کو چراغاں کیے ہوئے تھا اور ہم اپنی کیا حالت بتائیں، غالب کی طرح مدت ہوئی تھی یار کو مہماں کیے ہوئے۔ اسی حالت میں نظر چرانا اور جسم و جاں، بچانا فیض صاحب کی طرح ہمارے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ جگر لخت لخت کو خوب سمجھایا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں فردوس میں ان

کے بدلے ہمیں کئی حوریں ملیں گی، مگر دل ہے کہ مانتا نہیں اور ضدی بچے کی طرح بار بار سر ہلا ہلا کر کہتا ہے کہ حسن انسان سے نیٹ لوں تو ادھر تک دیکھوں۔“ (۳۲)

مصنف نے ”تھائی لینڈ کے رنگ“ میں اشعار کا استعمال موقع و محل کے مطابق اس طرح کیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ شعر اسی خاص موقع کے لیے لکھا ہو۔ اس طرح کی طرز تحریر پر وہی قدرت رکھ سکتا ہے جس کے حافظے میں مطلب بھی موجود ہو اور شاعرانہ فکر اس کی سوچ کا اہم جزو بن گئی ہو۔ سفر نامہ ”تھائی لینڈ کے رنگ“ میں مختلف جگہوں پر اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۷۱ء تک پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان جو اختلافات برپا ہوئے۔ جس کے نتیجے میں ان دونوں ممالک کے درمیان حکومتی سطح پر نفرت کی فضا پیدا ہو گئی۔ عوامی سطح پر اگر دیکھا جائے تو ان دونوں ممالک کے لوگوں کے دل ایک دوسرے کی غم اور خوشی میں ان کے ساتھ دھڑکتے ہیں، لیکن حکومتی اختلاف کی وجہ سے ان کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر الطاف یوسف زئی یوں ذکر کرتے ہیں:

”ایک زمانے میں پاکستان میں ایک اور زبان بھی بولی جاتی تھی جو اردو کی سہیلی تھی۔ پھر اس ملک میں بعد، بغض اور بے اعتباری کی ایسی بیاہ پھیلی کہ ملک دو لخت ہو گیا۔ اب یہی سہیلیاں ایک دوسرے کے خلاف دشنام طرازی کرتے ہوئے گولیوں کی زبان بولنے لگیں۔ نصف صدی ہونے کو آئی مگر نفرت کی شادابی اور ہریالی میں کوئی کمی نہ آئی۔“ (۳۳)

اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

”کانفرنس ہال میں جب افتتاحی تقریب منعقد ہوئی تو ہمارے ساتھ بنگلادیش کے نمائندے بھی تھے جن کی شکلیں اور لباس تو ہماری طرح تھے مگر دل ہم سے بہت دور تھے۔ نظریں ملانے سے زیادہ چرانے کی طرف مائل۔“ (۳۵)

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا سفر نامہ ”تھائی لینڈ کے رنگ“ جدید سفر نامہ نگاری میں نہ صرف خوب صورت اضافہ ہے بلکہ اس میں وہاں کی تہذیب و ثقافت کے رنگوں کے ساتھ خود مصنف کی ذات کے بہت سے رنگ فلپش بیک کے صورت میں حال کے جھروکوں میں رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں میں فلپش بیک کے مؤثر استعمال سے خوب رنگ جمایا ہے۔ بقول نذر عابد صاحب :

”ڈاکٹر الطاف اپنے اس سفر نامے میں ایک ایسے سیاح کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ جو تھائی لینڈ کے مناظر کو کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کا کھلی بانہوں سے استقبال کرتا ہے اور ان کے خیالات اور احساسات و جذبات کو کھلے ذہن سے پڑھتا ہے۔ ان کے اس کشادہ نظری اور وسعت قلبی نے انھیں تھائی لینڈ کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے اور وہاں کے باسیوں کے باطن میں جھانکنے کا ظرف اور حوصلہ عطا کیا ہے۔ وہ اپنے رواں دواں اسلوب کے وسیلے سے اپنے مشاہدات و تجربات کے بعض مشکل مراحل کے اظہار و بیان میں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔“ (۳۳)

دوران سفر اور تھائی لینڈ کی سر زمین پر اترتے ہی گھڑیوں پر وقت کی تبدیلی نے بہت کچھ یاد دلایا ایک خوب صورت حال اور ماضی کی یاد کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

”جہاز چڑھتے ہی تھائی لینڈ ایئر ہو سٹس نے جان بچانے کے طریقے سکھانے کے لیے جن اشاروں اور کنایوں کا سہارا لیا اسی سے ہماری جان نکل گئی۔۔۔ طویل مسور کن مسافت کے بعد ارض پاک کی فضاؤں سے دور تھائی سر زمین پر کھڑے تھے۔۔۔ ہمارے پروگرام کو آرڈینیٹر میر حسن نے اعلان کیا کہ اپنی اپنی گھڑیاں دو دو گھنٹے آگے کریں۔۔۔ سارے جب گھڑیوں کی اوقات بدلنے لگے تو مسافر کو نسیم عباسی کا شعر یاد آیا۔ ہر کوئی اپنی گھڑی کرتا ہے آگے پیچھے بیش و کم وقت کی رفتار نہیں کر سکتا۔“ (39)

تھائی لینڈ میں شلوار قمیض کے حوالہ سے بات ہوئی تو ان کو اپنے دوستوں کے مشوروں کے ساتھ مولانا روم کے باتیں بھی یاد آگئی جو انھوں نے لباس کے حوالہ سے کہی تھیں:

”تھائی لینڈ جانے سے قبل اکثر دوست مشورہ دیتے تھے کہ پینٹ کوٹ سلواو تم بین الاقوامی سفر پر جا رہے ہو، لباس بھی بین الاقوامی ہونا چاہیے۔ میں کہتا مجھے پینٹ کوٹ سے بیر نہیں طبیعت ادھر نہیں جاتی۔ میں نے اس بات کا ذکر فہد یوسف زئی سے کیا تو کہنے لگے۔ یہاں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں لہذا کوئی کسی کو اس نظر سے نہیں دیکھتا کہ کیا پہنتا ہے۔ مجھے مولانا

روم کی بات یاد آگئی کہ میں نے بہت سے انسان دیکھے ہیں جن کے بدن پر لباس نہیں ہوتا اور بہت سے لباس والے دیکھے ہیں جن کے اندر انسان نہیں ہوتا۔“ (۲۰)

اسی طرح جب وہ تھائی لینڈ میں اپنی گائیڈ نیر و من کا لباس دیکھتے ہیں تو ان کو وہ مکالمہ یاد آ جاتا ہے جو گورنمنٹ کالج برائے خواتین مانسہرہ کی پروفیسر تھینہ ناز کے ساتھ عورتوں کے لباس کے حوالہ سے کیا تھا۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

”نیر و من کا لباس انتہائی سادہ ہوتا تھا۔ تیس دنوں کی اس ٹریننگ میں انہوں نے صرف تین شرٹس تبدیل کیں جب کہ ہمارے ساتھ آئی ہوئی بعض خواتین ایک دن میں تین دفعہ لباس تبدیل کرتی تھیں۔ مسافر نے یہ سوال گورنمنٹ کالج برائے خواتین پروفیسر تھینہ ناز کے سامنے اٹھایا تو بولی ہر عورت کو خود نمائی کی خواہش ہوتی ہے اور جاذب نظر لگنے اور خوب صورت دکھنے کے لیے عورت کو ایسا کرنا پڑتا ہے۔ مگر بعض ایسی عورتیں بھی ہیں جو اس تکلف سے آزاد ہیں جوہ دکھنے اور بکنے کے جنجال سے دور ہیں جن کی زندگیوں کے کچھ اعلیٰ مقاصد ہوتے ہیں۔“ (۲۱)

تھائی لینڈ کی حکومت کے احسن اقدامات خاص طور پر ملک میں اعلیٰ درجہ کی متعدد یونیورسٹیاں اور دوسری علمی درس گاہیں تعمیر کرنے کے حوالہ سے نیر و من کی گفتگو کو سن کر اپنے ملک کے حکمرانوں کے تعلیم کے حوالہ سے رویے یاد آ گئے۔ اس بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”نیر و من کے بادشاہ کی ایک انفرادیت ہے۔۔۔ نیر و من کا بادشاہ اپنے ملک کی ترقی کو تعلیمی سرگرمیوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک میں متعدد یونیورسٹیاں اور دوسری علمی درس گاہیں تعمیر کی ہیں جہاں ان کے عوام اس علمی میراث کے حصول میں کوشاں ہیں۔ جس کا ہم مومنین دعویٰ ہی کر سکتے ہیں بادشاہ سلامت نے چار یونیورسٹیوں کے لیے ترانے (Anthem) بھی لکھیں۔۔۔ مسافر کو ہزارہ یونیورسٹی کے چانسلر اور صوبہ خیبر پختونخوا کے گورنر یاد آئے جن کی آمد پر یونیورسٹی کے اساتذہ کو چھٹی دی گئی اور ادارے میں تعلیمی سرگرمیاں بند کر دی گئی کہ مبادا چانسلر صاحب کی جان و مال خطر میں پڑ جائے اور اس سے زیادہ مضحکہ خیز صورت حال سوات کی ایک تعلیمی درس گاہ میں اُس وقت پیش آگئی جب جنگ سے

متاثرہ لوگوں کو صوبے کا وزیر خزانہ جو خود اسی ادارے سے فارغ التحصیل تھا سرکاری امداد دینے آیا ساتھ علاقے کا کمانڈنٹ بریگیڈیئر بھی تھا۔ ادارے کے پرنسپل، اساتذہ اور طلبہ کو کالج سے نکال باہر کیا گیا کہ صاحبان کو جان عزیز ہے نہ کہ تعلیمی ادارے اساتذہ اور جوان

(۳۲)۔

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی تھائی لینڈ کی سرزمین پر مساج سنٹروں کی بہتات دیکھ کر جہاں حیرت زدہ ہوئے وہیں پران کو لاہور مینار پاکستان کے اوپن ایئر مساج سنٹر بھی یاد آگئے جہاں دیسی طریقہ سے مساج کیا جاتا ہے اور مساج کرنے والے تھائی عورتوں کی جگہ مرد حضرات ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ مثال ملاحظہ ہوں:

”مختلف مساج سنٹرز میں خاندانوں کے خاندان باپ، بیٹی، ماں، بیٹا الگ الگ چار پائیوں پر ایک ہی ہال میں لیٹے تھائی دو شیز اوں سے باجماعت مساج کروا رہے ہوتے ہیں۔ ویسے تو لاہور شہر میں بھی مساج کاروائی طریقہ رائج ہے۔ مینار پاکستان شاہی قلعہ ریلوے سٹیشن جناح لائبریری اور بڑی پارکوں میں گندے اور میلے ہاتھوں سے دوائی سے خالی بوتلوں میں سرسوں کا تیل ڈالے مالش مالش کی آوازیں لگانے والے غیر قبول صورت لڑکے نظر آئیں گے۔ لاہور کے پارکوں میں خدا کے ایسے بندے بھی دکھتے ہیں جو کپڑے اتارے جانگیاں پہنے کھلے آسمان تلے زمین پر لیٹے اپنے صاف و شفاف بدن پر ان گندے اور میلے ہاتھوں سے مالش کے نام پر میل مل رہے ہوتے ہیں اس کے مقابلے میں تھائی لینڈ میں ماحول پاک و صاف اور رومانوی ہوتا ہے۔“ (۳۳)

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کے سفر ناموں میں موازناتی و تقابلی انداز بے شمار جگہوں پر ملتا ہے۔ انھوں نے تھائی لینڈ کے واقعات و حالات بیان کر کے کہیں کہیں پاکستان سے اس کا تقابل کیا ہے۔ وہ کبھی وہاں کے حکمرانوں کا تقابل پاکستانی حکمرانوں سے کرتے ہیں تو کبھی وہاں کے سیاسی حالات کا جائزہ لے کر پاکستان کے سیاسی حالات سے اس کا موازنہ کر کے اپنے وطن کے حالات پر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کا یہ انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے وطن سے حد درجہ محبت کرتے ہیں۔ اس لیے موازنے کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے اپنے وطن کے حالات پر افسوس کرتے ہوئے یہاں بہتری کے خواہش مند ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”میں نے نیرومن سے پوچھا کہ آپ کے ہاں ہاتھی اور اژدھے سے زیادہ محبت کی جاتی ہے جہاں بھی جائیں چاہے شہر ہو یا قریہ ہاتھی اور اژدھوں کے دیو قامت مجسمے لگے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دوسروں کو تحفے کے طور پر دیئے جانے والے سونیر پر بھی ہاتھی اور اژدھے کی شکلیں بنی ہوتی ہیں۔ نیرومن نے بائیں ہاتھ کی انگلیاں سکیر کر اس سے مکا بنایا اور کہا: They are Symbol of power میں نے کہا اچھا تھائی عوام بھی ہم پٹھانوں کی طرح جنگجو ہیں۔ انھوں نے ہنستے ہوئے پوچھا: What is your Symbol of power ? میں سوچ میں پڑ گیا۔ توپ، مزائل، بندوق، پستول، خنجر، بم، راکٹ لانچر، ہینڈ گرنیڈ، طالبان، ٹارگٹ کلر، بھتہ خور، انڈر ورلڈ، دہشت گرد اور پتہ نہیں اور کیا کیا۔ مگر یہ ساری چیزیں کیا واقعی طاقت کی علامت ہیں۔ اگر ہیں تو ہمارے ملک میں تو ان کے نہ دیو قامت مجسم لگے ہیں اور نہ ان سے عوامی سطح پر محبت کا اظہار ملتا ہے بلکہ ان چیزوں کو تو قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔“ (۴۵)

ایک اور جگہ دونوں ملکوں کے سیاسی منظر نامے کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

”میں نے ویرویٹ جو کے سامنے جب تھائی لینڈ کا سیاسی منظر نامہ رکھا تو اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہنے لگے اس میں کوئی شک نہیں ہمارا اور پاکستان کا سیاسی منظر نامہ کچھ شاندار نہیں وردی پوشوں نے دونوں ممالک کے عوام کی گردنوں میں طوق ڈالے ہیں۔ آپ کے سیاستدانوں کی طرح ہمارے سیاستدان بھی کرپٹ اور نااہل ہیں۔ سنا ہے کرپشن کے حوالے سے اس وقت پاکستان دنیا میں انتالیس نمبر پر ہے اور تھائی لینڈ تینتیس نمبر پر۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کے حکمران چوری کا پیسہ ملک سے باہر بھجواتے ہیں اور ہمارے حکمران ملک کے اندر لگاتے ہیں۔ ہم اپنے پرانے سرمائے کو بھی محفوظ کیے ہوئے ہیں اور آپ اپنی نئی املاک کو سرکاری کہہ کر ان کی توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بیسویں صدی کے اواخر میں پاکستانی ہنرمندوں نے ہمیں زندگی کی دوڑ میں عالمی برادری کے شانہ بشانہ چلنے میں مدد دی مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب ہم آپ لوگوں سے ترقی کی اس دوڑ میں بہت آگے ہیں۔“ (۴۶)

اس کے علاوہ تھائی لینڈ میں اپنی گائیڈ نیرو من اور ایچ۔ ای۔ سی کی نور آمنہ کا مقابل بہترین انداز میں کرتے ہیں:

”اپنے کام میں مستعدی اور تکمیلیت پسندی کی خواہش میں دن رات مگن نیرو من اگر برف ہے تو نور آمنہ نار، ایک میں حدت ہے تو دوسری میں شدت، ایک طلانی تو دوسری نقرئی، ایک شعلہ فگن تو دوسری اُجلی اور نورانی۔ دونوں معمولات زندگی کے لیے درکار اور کارآمد۔ انتہائی سادہ لباس میں ملبوس اتنی سادہ و پرکار اور باہمت خواتین جلال، جمال اور کمال کی صفات سے مالا مال اور جہاد زندگی میں یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی شمشیروں سے لیس، زندہ ہوں تو مہمان اور گزر جائیں تو تہہ خاک ”از من و تو زندہ تر“۔“ (۴۷)

ڈاکٹر الطاف یوسفزئی کے سفر ناموں کی کامیابی کی اصل وجہ ان کا اسلوب بیان ہے۔ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو دل کش اور مؤثر اسلوب میں بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر نامے اپنی شگفتگی، اسلوب کی دل آویزی اور افسانوی طرز احساس کی بدولت نمایاں ہیں۔ وہ مشاہدات کے اظہار کے لیے الفاظ کا استعمال اس انداز سے کرتے ہیں کہ قارئین ان کے سفر نامے پڑھتے ہوئے مناظر کی ہو بہو تصویر آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

ان کے سفر ناموں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے سفر نامے اپنے اسلوب، منفرد تکنیک، تخیل اور حقیقت کے حسین امتزاج کی وجہ سے شہرت کے حامل ہیں اور جدید سفر ناموں میں بھی سرفہرست ہیں۔ ان کے افسانوی، ڈرامائی انداز نے سفر نامے کو دل چسپ اور عام فہم بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں وطن اور اہل وطن سے ہمدردی اور محبت کا جذبہ عیاں ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے سفر نامے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ انھوں نے سفر ناموں کی شکل میں قاری کو ایک تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور معلوماتی دستاویز مہیا کی ہے اور فلیش بیک کی تکنیک سے خوب کام لے کر اپنی ذات اور خطے سے منسلک واقعات و مشاہدات کو حال کے آئینے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حوالہ جات:

- ۱۔ الطاف یوسف زئی، ڈاکٹر، تھائی لینڈ کے رنگ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص: ۱۱
- ۲۔ ایضاً، ص: ۱۳
- ۳۔ ایضاً، ص: ۵۰
- ۴۔ ایضاً، ص: ۵۲
- ۵۔ ایضاً، ص: ۷۱
- ۶۔ ایضاً، ص: ۸۸
- ۷۔ ایضاً، ص: ۹۹، ۱۰۰
- ۸۔ ایضاً، ص: ۱۸
- ۹۔ ایضاً، ص: ۹۸
- ۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۰
- ۱۱۔ ایضاً، ص: ۶۰
- ۱۲۔ ایضاً، ص: ۸۱
- ۱۳۔ ایضاً، ص: ۵۹
- ۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۶
- ۱۵۔ ایضاً، ص: ۲۰
- ۱۶۔ ایضاً، ص: ۸۴
- ۱۷۔ ایضاً، ص: ۷۱
- ۱۸۔ ایضاً، ص: ۲۷
- ۱۹۔ ایضاً، ص: ۳۱

- ۲۰۔ ایضاً، ص: ۳۵
- ۲۱۔ ایضاً، ص: ۱۹
- ۲۲۔ ایضاً، ص: ۴۵
- ۲۳۔ ایضاً، ص: ۷۲
- ۲۴۔ ایضاً، ص: ۲۱
- ۲۵۔ ایضاً، ص: ۱۱
- ۲۶۔ ایضاً، ص: ۱۹
- ۲۷۔ ایضاً، ص: ۵۸
- ۲۸۔ ایضاً، ص: ۲۷
- ۲۹۔ ایضاً، ص: ۳۷
- ۳۰۔ ایضاً، ص: ۸۹، ۸۸
- ۳۱۔ ایضاً، ص: ۷۵، ۷۴
- ۳۲۔ ایضاً، ص: ۱۰۲
- ۳۳۔ ایضاً، ص: ۲۹